

مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ ایک ”ترقی پسند“ مذہبی مفکر ایک جائزہ

ڈاکٹر حمیرا ناز ☆

ABSTRACT

Molana Saeed Akber Abadi (1908-1985) was an eminent scholar, erudite author, and self styled critic of Sub continent- his educational and religious services were immense and enormous. He was one of the most distinguished personalities of the sub-continent due to his services to Islam. He benefited from renowned religious and worldly educational institutes and also taught there. Therefore he possessed great combination of traditional and modern values. He was among the some of enlightened, progressive and modern scholars of sub-continent. He believed to comprehend the demands of modern world and to shape Islamic teaching in accordance with it, so he thought Ijtihad as the need of modern time.

He kept casuistical and prophetic vision to find new venues in religion in changing world, that's why he embraced the way jurisprudence extensionism as his religious propensity. He rightly thought that the complex issues and variety of problems can not be

☆ اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

addressed without jurisprudence extensionism, tolerance, and insisting on specific sect. that's why he adopted balanced, moderate and tolerant views in controversial and jurisprudential issues. This is the most significant aspect of his personality which inspires me most, and it is the topic of my present article.

بر عظیم کے معروف اسکالر مولانا سعید احمد اکبر آبادی دینی و علمی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، وہ اپنے علم و فضل، اخلاق و سیرت، جامعیتِ علم و فن اور تعلیمی و تحقیقی خدمات کے لحاظ سے قدیم اور جدید علمی حلقوں میں ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک معلم کی حیثیت سے ہندوستان اور یورپی ممالک کی درس گاہوں میں تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دیں اور ایک عالم کی حیثیت سے اشاعتِ دین اور تبلیغ کا فریضہ بھی مختلف طریقوں سے انجام دیتے رہے۔ آپ کی علمی و دینی اور تدریسی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ انہوں نے قدیم و جدید دونوں طرح کی درس گاہوں سے اکتسابِ علم کیا^(۱) اور اپنی علمی زندگی کا آغاز تدریس و تحقیق کے شعبے سے کیا۔ وہ سینٹ اسٹیفن کالج (دہلی)، مدرسہ عالیہ کلکتہ، علی گڑھ یونیورسٹی اور کئی دیگر اداروں میں مدرس اور لیکچرار بھی رہے۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ یورپ و مغرب کے اہم تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔^(۲) اس دوران میں انہوں نے قرآن

۱- مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایک طرف دارالعلوم دیوبند سے وابستہ تھے تو دوسری طرف مولانا نے ذاتی طور پر انگریزی، حساب، جغرافیہ اور تاریخ کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ اور ۱۹۳۲ میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی کے امتحانات پرائیویٹ دیے اور خود کو جدید تعلیم سے بہرہ مند کرنے کے لیے دہلی یونیورسٹی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ لے کر وہاں سے ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اسی طرح انہیں اُردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبان و ادب میں رسوخ اور رفتہ رفتہ تحریر و تقریر میں عبور حاصل ہو گیا وہ ہندوستان کے اُن گنے چنے علماء میں سے تھے جنہیں اُردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔ جمیل مہدی، نظرات، مشمولہ: برہان، دہلی: ندوۃ المصنفین، جلد ۹۵، شمارہ ۶ (جون ۱۹۸۵ء) ص ۲

۲- مولانا کے علمی اور دینی کمالات کے اعتراف میں یورپ اور امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں نے انہیں وزٹنگ پروفیسر کے اعزاز سے نوازا۔ ۱۹۶۲ء میں انہیں مک گل یونیورسٹی مونٹریل (کینیڈا) میں بحیثیت مہمان پروفیسر مدعو کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے علوم شرقیہ کے حلقوں کو اپنے خیالات اور علمی موضوعات کی روشنی سے بھی متاثر کیا۔ ایضاً، ص ۳-۴

و حدیث، سیرت النبی ﷺ اور اسلامی تاریخ کو اپنی تحقیق و مطالعہ کا خصوصی موضوع بنایا اور ان موضوعات پر ایک درجن سے زائد کتابیں (۳) اور سینکڑوں مقالات تحریر کئے جو ان کے علمی و فکری نظریات کا گرانقدر سرمایہ اور ان کے طرز نگارش کے بھی آئینہ دار ہیں۔ علمی و تحقیقی کاوشوں کے حوالے سے مولانا کا دوسرا کارنامہ ندوۃ المصنفین (دہلی) کا قیام ہے۔ وہ اس کے نمائندہ رسالہ ماہنامہ برہان کے ۱۹۳۸ء سے اپنی وفات ۱۹۸۵ء تک تقریباً سینتالیس برس بطور مدیر فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ آپ ایک ممتاز و معروف اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ بر عظیم کے ایک بلند پایہ مقرر اور خطیب بھی تھے۔ آپ نے نہ صرف اسلامی اور بین الاقوامی اجتماعات میں شرکت کی بلکہ اپنے علمی مقالات اور فاضلانہ تقاریر سے اسلام کی نمائندگی اور ملت اسلامیہ کی ترجمانی کا فریضہ بھی انتہائی خلوص اور درد مندی سے انجام دیا۔ (۴) اس لحاظ سے وہ بلاشبہ ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے اور اپنی گونا گوں علمی خدمات کی وجہ سے بر عظیم پاک و ہند کی چند نمایاں و ممتاز شخصیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ (۵)

زیر نظر مقالے میں مولانا کی شخصیت کے ایک اہم پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے جو فی الحقیقت انتہائی توجہ کا مستحق ہے اور جس کے اثرات آپ کی تحریروں میں واضح نظر آتے ہیں۔ یہ پہلو آپ کی مذہبی امور و مسائل میں اعتدال پسندی اور وسیع النظری ہے۔ آپ کا شمار بر عظیم کے ان روشن خیال اور ترقی پسند علماء میں ہوتا ہے جو ہمیشہ نئی باتوں کو اپناتے اور نئی قدروں کا احترام کرتے تھے۔ اسی لیے ہر حلقہ انہیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، خواہ اس کا تعلق کسی بھی سیاسی و دینی مسلک سے کیوں نہ ہو (۶) اگرچہ وہ دیوبند کے فاضل تھے اور آخر دم تک اسی سے وابستہ رہے۔ تاہم مدرسہ دیوبند سے متعلق ہونے اور حنفی فقہ سے منسلک

۳- آپ نے دینی، تاریخی، ادبی، تنقیدی اور سیاسی موضوعات پر جو بلند پایہ علمی و تحقیقی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں ان میں السرق فی الاسلام، غلامان اسلام، فہم قرآن، وحی الہی، مسلمانوں کا عروج و زوال، صدیق اکبرؓ، ہندوستان کی شرعی حیثیت، چار علمی مقالات، عثمان ذوالنورینؓ، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔ سیرت و شخصیت اور علمی اور عملی کارنامے، علمائے ہند کا سیاسی موقف اور خطبات اقبال پر ایک نظر بہت مشہور ہیں۔

۴- صلاح الدین یوسف، مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم علمی تبحر، اعتدال اور فتنی توسع کی حامل شخصیت، مشمولہ: برہان، جلد ۹۹، شمارہ ۶، (جون ۱۹۸۷ء)، ص ۳۴۳

۵- ایضاً، ص ۳۴۳-۳۴۵

۶- منظر شہزاد، ”سعید احمد اکبر آبادی جیسے روشن خیال کبھی نہیں ہوتے“، روزنامہ جنگ، کراچی (۲۷ جون ۱۹۸۶ء)، ص ۱۱

ہونے کے باوجود آپ کی شخصیت کے اندر توسع کا پہلو نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنے نظریات میں اُس سختی سے احتراز کیا جو علمائے دیوبند کا خاصہ رہی ہے۔ وہ مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کے درمیان اختلافات کے حل کے حوالے سے معتدل، نرم خو اور متوازن فکر کے حامل مشہور تھے۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کی فکر کے اثرات کے تحت عالمِ اسلام کے مختلف مہمذ فرقوں میں تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی اور عالمِ اسلام کے پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے تمام فقہی مکاتب سے استفادہ پر زور دیا۔^(۷) آپ نے نہ صرف فقہی توسع کو بطور مسلک اپنا یا بلکہ ایک جگہ اس کا برملا اظہار بھی فرمایا۔ چنانچہ وہ بنگلور (جنوبی ہند) کی ایک کانفرنس کی روداد لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”میں نے مسلم معاشرے میں پائے جانے والے رجحانات کا ذکر کیا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ رجحانات تین قسم کی ہوتے ہیں:

۱- قدامت پرستی (Orthodoxy)

۲- ترقی پسندی (Progressiveness)

۳- آزاد فکری (Liberalism)

۱- اول الذکر کی خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ زمانے کا خواہ کوئی مسئلہ یا کوئی معاملہ ہو، بہر حال اس کا حل کسی ایک فقہی مسلک کی روشنی میں تلاش کیا جائے، اور سرِ مو اس سے انحراف روا نہ رکھا جائے۔

۲- اس کے بالمقابل ترقی پسندی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اصل قانون قرآن و حدیث میں ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے، وہ بجائے خود قانون نہیں ہے۔ اس بناء پر کسی جدید مسئلے کا حل اولاً براہِ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔

۳- اب رہا تیسرا رجحان، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف قرآن کو مآخذ تسلیم کرتا ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتا، پھر اپنے لیے قرآن کی آزاد اور بے قید و بند تفسیر و توضیح کا حق بھی مانتا ہے۔ میں

۷- عبد العلی، *Professor Akbarabadi: Some Distinctive Features of His Religious Thought and Personality*،

مشمولہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادی احوال و آثار (مرتبہ) محمد سعید عالم قاسمی،

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبہ سنی دینیات (۲۰۰۵ء) ص ۳

نے کہا کہ میرا تعلق دوسرے طبقے سے ہے اور یہی رجحان میرے نزدیک صحیح ہے۔“ (۸)

اسی طرح ایک اور موقع پر مولانا نے اپنے مذہبی طرز فکر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

راقم الحروف کا قصور اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ دیوبند کا فیض یافتہ، جمعیت العلماء کا ممبر اور قدر دان ضرور ہے، لیکن اپنے دل و دماغ کو ہمیشہ کھلا اور آزاد رکھتا ہے اور کبھی کسی مسئلہ پر جماعتی عصبیت اور تخریب کے ساتھ غور نہیں کرتا، اس بناء پر دارالعلوم دیوبند ہو یا ندوہ، جمعیت علماء ہو یا اسلامی جماعت، تبلیغی جماعت ہو یا دینی کونسل ان سب اداروں کے اکابر اور کارکنوں کے خلوص، علم و فضل اور اسلامی حمیت و جوش کا دل سے معترف اور قدر دان ہے اور یہ جماعتیں جو کام کر رہی ہیں ان کی اہمیت و افادیت کا منکر نہیں، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان جماعتوں کی کسی رائے، کسی طریق کار اور یا کسی نظریے سے بھی اختلاف نہیں کر سکتا۔ ایمانداری سے اختلاف ہر انسان کا قدرتی حق ہے اور اُسے یہ حق استعمال کرنا چاہیے۔ معاشرے کی شعوری صلاح و فلاح اسی پر موقوف ہے۔ پھر میں جس طرح کسی جماعت کو بھی تنقید سے بالا نہیں سمجھتا، اسی طرح کسی شخص واحد کو بھی، خواہ وہ دنیا کا کتنا ہی بڑا امام اور شیخ وقت ہو، تنقید سے ماورا نہیں مانتا، مگر ساتھ ہی یہ بھی جانتا ہوں کہ ارادت و عقیدت، ادب و احترام اور تنقید و اختلاف ان کے حدود کیا ہیں اور ان حدود میں رہ کر کس طرح ایک شخص دونوں کے مقتضیات و مطالبات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ (۹)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا خیال تھا کہ مسلمانان ہند کو چند قانونی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور اس

۸- سعید احمد اکبر آبادی، بنگلور میں ایک اہم سیمینار اور اس نواح کا میرا پہلا سفر، مشمولہ: برہان، جلد ۵۹، شماره ۴ (اکتوبر

۱۹۶۷ء) ص ۲۱۳

۹- ایضاً، نظرات، مشمولہ: برہان، جلد ۴۹، شماره ۵ (نومبر ۱۹۶۲ء) ص ۲۶۰

کی واحد راستہ اجتہاد ہے۔ وہ اجتہاد کو دورِ حاضر کی ضرورت سمجھتے تھے۔^(۱۰) اُن میں نئے حالات کے مطابق دین کی نئی راہیں پیدا کرنے کا احساس و شعور اور مجتہدانہ بصیرت موجود تھی۔ اس خوبی نے انہیں اہل علم کے حلقوں میں مقبول بنا دیا تھا۔ ایک جگہ انہوں نے اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ:

دین اسلام دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا دین اور دوسرا شریعت۔ دین کا تعلق بنیادی اُصول و ضوابط سے ہے گو کہ دین کی تشریحات مختلف پیغمبروں نے اپنی اپنی شریعت کے مطابق کیں اور اس کی تکمیل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے ہوئی۔ دین بنیادی طور پر حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک ایک ہی رہا۔ جہاں تک شریعت کا تعلق ہے اس میں وہ قوانین و ضوابط ہوتے ہیں جن کا دار و مدار دین پر ہوتا ہے، گو کہ عملی اعتبار سے دین و شریعت کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا تاہم شریعت میں تھوڑی سے پچک اور نرمی ہوتی ہے تاکہ کسی خاص قوم کی ضرورت اور زمانے کے تقاضے کے مطابق ضروری قوانین و ضوابط بنائے جاسکیں اور ہر دور کی ضرورت کے مطابق اس میں مناسب ترامیم کی جاسکیں۔ لہذا حضور اکرم ﷺ کے وصال کے بعد حالات کی تبدیلی کے ساتھ جو نئے نئے مسائل درپیش ہوں گے جن کی وجہ سے قرآن و سنت کی روشنی میں نئے ضوابط بنائے جائیں گے اور پرانے قوانین میں تبدیلی کی جائے گی۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اجتہاد کے بغیر چارہ کار نہیں۔ اسی میں اپنی رائے سے کام لینا اجتہادِ شرعی کہلاتا ہے۔^(۱۱)

اسی لیے مولانا نے اسلامی شریعت کو متحرک اور حالات کے مطابق ڈھل جانے والا قرار دیا جس میں ہر دور اور ہر مقام کے لحاظ سے اُصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس سوال کے جواب میں کہ ہندوستان کو دارالاسلام سمجھا جائے یا دارالکفر۔ انہوں نے کہا کہ موجودہ دور کے مختلف فقہی مباحث کی تقسیم کے لیے دارالاسلام اور دارالکفر کی پرانی فقہی تقسیم غیر عملی اور غیر ضروری ہے۔ دنیا کا حالیہ سیاسی نظام، جمہوریت، قومیت اور شہریت کے حوالے سے نئے تصورات اس تقسیم کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔^(۱۲) آپ

۱۰- ایضاً، دورِ جدید میں اسلامی قانون، مشمولہ: مُہان، جلد ۸۷، شمارہ ۳ (ستمبر ۱۹۸۱ء)، ص ۵۳۷

۱۱- ایضاً، ص ۵۳۵

۱۲- ایضاً، جلد ۸۷، شمارہ ۴، (اکتوبر ۱۹۸۱ء) ص ۶۰۹

نے ایک معتدل اور ترقی پسند مسلم مفکر کی طرح نہ صرف بعض متنازعہ مسائل کے حل پیش کیے بلکہ انہوں نے اپنے ہم عصر علماء پر زور دیا کہ وہ عصر حاضر کے مسائل کے حل کے لیے اپنے ذہن و نظر کو وسیع رکھیں۔ چنانچہ ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ :

دور حاضر کے معاشرتی اور سیاسی نظام کے زیر اثر انسانی تہذیب ایک جدید دور میں داخل ہوئی ہے اس لیے علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جدید مسائل کے اسلامی حل کے حوالے سے مستعد اور فعال کردار ادا کریں۔ نیز ان مسائل پر کھلے ذہن کے ساتھ غور و فکر کرنے کے بعد قرآن و حدیث، اسلامی فقہ اور قوانین اسلام کی تاریخ کی روشنی میں ان کا حل تجویز کریں۔ اس طرح کر کے وہ اسلام اور مسلمانوں کی عظیم خدمت انجام دیں گے۔ (۱۳)

چنانچہ ہم یہاں پر بطور مثال آپ کے اسی مسلک، فقہی توسع، اعتدال پسندی کو ملحوظ رکھتے ہوئے موجودہ دور کے مسلمانوں کے چند اہم متنازعہ مسائل پر روشنی ڈالیں گے، جن کے حل کے لیے آپ نے مختلف مسالک کے فقہی فیصلوں کو بلا تکلف تسلیم کیا اور حنفی فقہ کو نظر انداز کر دیا۔

طلاق

طلاق مباحات میں سے ایک ایسا مباح عمل ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں مسلم معاشرے کے کچھ غیر محتاط افراد کے طرز عمل سے مسلم معاشرتی نظام کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی بے گناہ اور مظلوم عورتوں کو سخت پریشانی اور کلفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مولانا اکبر آبادی نے بھی اس مسئلے پر اپنا نقطہ نظر بیان کیا۔ آپ طلاق کے مسئلے پر اہل حدیث مکتبہ فکر سے متفق تھے کہ ایک نشست میں جتنی دفعہ بھی طلاق دی جائے، اسے ایک ہی تصور کیا جائے گا۔ اس معاملے میں انہوں نے واضح حنفی فقہی اصول کو چھوڑ کر اہل حدیث مسلک اور امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے نقطہ نظر کو ترجیح دی۔ آپ کا کہنا تھا کہ ایک نشست میں جتنی دفعہ بھی طلاق کا لفظ کہا جائے گا اسے ایک ہی تصور کیا جائے گا تاکہ حلالہ جیسی مذموم معاشرتی خرابیوں سے بچا

جاسکے۔ (۱۴)

دارالحرب میں مسلمانوں کا کافروں سے سود لینا:

فقہ حنفی کا ایک مشہور مسئلہ ہے کہ دارالحرب میں مسلمانوں کا کافروں سے سود لینا جائز ہے۔ مولانا اکبر آبادی ۱۹۶۳ء میں مجمع الجوٹ الاسلامیہ قاہرہ کی کانفرنس میں تشریف لے گئے اور وہاں کے علمی مباحث میں حصہ لیا جس کی مختصر روداد انہوں نے ماہنامہ ”بُرہان“ دہلی میں خود اپنے قلم سے لکھی تھی۔ اس کانفرنس میں بنک کے سود پر گرما گرم بحث ہوئی۔ اس میں شیخ ابوزہرہ مرحوم نے سود کی حرمت پر بڑی زوردار تقریریں کیں، لیکن شیخ نے فقہ حنفی کا مذکورہ مسئلہ بھی اپنی ایک تقریر میں ضمنی طور پر بیان فرمادیا اور کہا کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حربی اور مسلم معاملہ میں ربوا نہیں ہے یعنی وہ جائز ہے۔ (۱۵) مولانا اکبر آبادی نے اس کے جواب میں ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ اگر امام صاحب کی طرف اس کا انتساب صحیح ہے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ جب قرآن میں وَحَسْرَمُ الرَّبْوَا عام اور مطلق ہے تو کسی نص یا حدیث متواتر کے بغیر اس کی تخصیص اور تقلید کس طرح جائز اور درست ہو سکتی ہے؟ مزید وضاحت کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ائمہ اور فقہاء اس بات میں اختلاف کر سکتے ہیں کہ فلاں معاملہ ربوا کے تحت آتا ہے یا نہیں؟ لیکن اگر کسی معاملے کی نسبت یہ ثابت ہو جائے کہ ربوا کی تعریف اس پر صادق آتی ہے تو اب دنیا میں کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ وہ معاملہ جائز ہے۔ (۱۶)

بنک کا سود

بنک کا سود اُن چند مسائل میں سے ایک ہے جن پر علماء اسلام نے کافی بحث کی ہے۔ جبکہ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ بھی بہت آسان مسئلہ ہے۔ ”بیع“ اور ”ربوا“ دو ایسے الفاظ ہیں جن پر قرآن نے مالی لین دین کے سلسلے میں اپنے صاف صاف احکامات دیے ہیں۔ اول الذکر حلال چیز ہے جبکہ دوسری چیز (یعنی ربوا) حرام ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے لین دین بھی ہیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے ربوا میں شمار فرمایا ہے اس وجہ

۱۴- مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم علمی تبحر، اعتدال اور فقہی توسع کی حامل شخصیت، حوالہ سابقہ، ص ۳۴۵-۳۴۶

۱۵- سعید احمد اکبر آبادی، قاہرہ میں مجمع الجوٹ الاسلامیہ کی دوسری سالانہ کانفرنس، مشمولہ: بُرہان، جلد ۵۵، شمارہ ۲ (اگست

۱۹۶۵ء)، ص ۱۷۷

سے وہ بھی حرام ہیں۔ اس کے مقابلے میں کچھ ایسے مالی لین دین ہیں جن کو رسول ﷺ نے ”بیع“ میں شمار فرمایا ہے اس لیے وہ حلال ہیں۔^(۱۷) مولانا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی ان دونوں قسم کے مالی معاملات کا جن کا رسول اللہ ﷺ نے ذکر کیا ہے بنظر غائر مطالعہ کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ رلوا کا حقیقی مطلب ناجائز طور پر اقتصادی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی غربت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے ذاتی مفادات اور قساوت کو سامنے رکھ کر نیز دوسرے کی خوشحالی یا تنگدستی سے قطع نظر کر کے بہت زیادہ امیر بن جاتا ہے۔ لہذا مولانا کا کہنا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد پھر موجودہ بنگاری نظام کا بغور جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے بعد یہ طے کرنا ہوگا کہ بینک کا انٹرسٹ (سود) حقیقی معنوں میں قرآن میں مذکور ”رلوا“ کے تحت آتا ہے یا نہیں اور اگر آتا ہے تو پھر یہ مکمل ”رلوا“ ہے یا جزوی ”رلوا“، یا یہ کہ یہ مضاربت اور شرکت کی ہی کوئی قسم ہے۔ مضاربت وہ تجارتی معاملہ ہے جس کو اسلام نے جائز قرار دیا ہے۔^(۱۸) اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے بہر حال یہ وہ راستہ ہے جس کو ایک مجتہد اختیار کرنے کے بعد کوئی نتیجہ نکال سکتا ہے اور وہ اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل تلاش کر سکتا ہے۔^(۱۹) سودی بینک کاری کے موضوع پر مولانا نے یہ رائے تقریباً تیس سال قبل پیش کی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب اسلامی دنیا میں بینک کاری کی اسلامائزیشن کا بڑا چرچا تھا اور آج بھی یہ موضوع انتہائی توجہ کا حامل ہے تاہم مولانا نے اس موضوع پر ایک اصولی موقف اختیار کیا ہے اور اپنا کوئی فیصلہ مسلط کرنے کے بجائے اسلامی اصول و قواعد کی روشنی میں اس علم و فن کے ماہرین کو فیصلے کا اختیار دے دیا ہے۔

انشورنس (بیمہ)

مولانا کی رائے ہے کہ انشورنس (بیمہ) بھی مسائل کی مندرجہ بالا قسم میں شمار ہوتی ہے۔ اس پر عرب دنیا کے مشہور عالم شام کے شیخ مصطفیٰ اور مصر کے شیخ ابوزہرہ کے درمیان کافی گرم گرم بحث ہوئی ہے۔ شیخ مصطفیٰ نے اپنی کتاب الثابین میں انشورنس (بیمہ) کو جائز قرار دیا ہے۔ جبکہ ابوزہرہ نے اس کا انکار کیا ہے اور اس کے ناجائز ہونے کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ اس کی روشنی میں مولانا فرماتے ہیں کہ پوری بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ آیا انشورنس (بیمہ) رلوا کی تعریف میں داخل ہوتی ہے اور اس کی ہی ایک قسم

۱۷- ایضاً، دور جدید میں اسلامی قانون، حوالہ سابقہ، جلد ۸۷، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۸۱ء)، ص ۵۹۴-۵۹۵

۱۸- ایضاً

۱۹- ایضاً

ہے یا نہیں۔^(۲۰) یہ ایک مجتہد کو دیکھنا ہوگا۔^(۲۱)

ہندوستان دارالکفر ہے یا دارالاسلام

عمومی رائے یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی ملک دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ دارالحرب ہوگا یا دارالاسلام۔ انگریزی عہد کے ہندوستان اور آزاد ہندوستان کے دارالاسلام اور دارالحرب ہونے سے متعلق علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علماء کی ایک بڑی تعداد نے اسے دارالحرب قرار دیا جو آج بھی اسی حالت پر برقرار ہے۔ جب کہ کچھ علماء نے اسے دارالاسلام ہی مانا ہے۔^(۲۲) لیکن مولانا اکبر آبادی اس تقسیم سے اتفاق نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں آپ کا کہنا ہے کہ دنیا کے موجودہ سیاسی اور سماجی نظام نے جس کی وجہ سے انسانی تہذیب و تمدن کے ایک نئے دور نے جنم لیا ہے، علماء کو مجبور کیا ہے کہ وہ اس مسئلے پر ازسرنو غور کریں اور قدیم فقہاء کے نظریات کا جائزہ لیں جس طرح کہ پہلے ایک غیر مسلم ریاست کو دارالہجرت کہا جاتا تھا اور فقہاء نے دنیا کو دو قسموں میں منقسم کیا تھا (i) مسلم ریاست اور (ii) غیر مسلم ریاست۔ مسلم ریاست کو دارالاسلام اور غیر مسلم ریاست کو دارالہجرت کہا تھا۔^(۲۳) لیکن اب مولانا کے خیال میں مندرجہ بالا تقسیم موجودہ حالات میں منطبق نہیں ہوتی۔ کیونکہ مختلف ممالک کا موجودہ سیاسی ڈھانچہ، جمہوری نظریات اور ان پر عمل، بنیادی شہری حقوق اور کسی ملک میں رہنے والے کو وطنی (شہری) حقوق کا حاصل ہونا وغیرہ ایسے نظریات ہیں جو عالمی طور پر قبول کیے جا چکے ہیں اور مسلم و غیر مسلم تقریباً تمام ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے مندرجہ بالا تقسیم کے اعتبار سے مسلم و غیر مسلم ممالک میں حد فاصل قائم کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے اور مذہبی اعتبار سے اس کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے۔^(۲۴) تاہم اس موضوع کا ایک وہ پہلو بھی ہے جو مسلم سیاسی

۲۰- ایضاً

۲۱- مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا دینی و علمی مسائل و امور پر کلام کا ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے کہ وہ ہر مسئلے پر عام مفتیوں کی طرح فتویٰ صادر کرنے کو پسند نہیں کرتے بلکہ مسئلے کی نشاندہی کر کے غور و فکر کا سامان مہیا کرتے ہیں چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے موجودہ دور کے مسلمانوں کے چند اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے بارے میں فرمایا کہ: وہ اس جگہ ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں نہ کہ ایک حکم (جج) کی حیثیت سے کسی مسئلے میں فتویٰ دینا میرا کام نہیں۔ یہاں پر صرف جستجو اور مذاکرہ ہی مقصد ہے۔ ایضاً، ص ۵۸۸

۲۲- محمد شمیم اختر قاسمی، ہندوستان کی شرعی حیثیت: مولانا اکبر آبادی کی نظر میں، مشمولہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادی احوال و آثار (مرتبہ) محمد سعود عالم قاسمی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، شعبہ سنی دینیات (۲۰۰۵ء)، ص ۲۰۶

۲۳- دورچید میں اسلامی قانون، حوالہ سابقہ، جلد ۸، شماره ۴ (اکتوبر ۱۹۸۱ء)، ص ۶۰۹

۲۴- ایضاً

مفکرین، اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کی نوعیت اور مقاصد کے ضمن میں کرتے ہیں۔ ہر چند کہ یہ بحث قدیم ہے مگر موضوع کے اساسی فکر و فلسفہ کے اعتبار سے اسلامی اور غیر اسلامی ریاست کی نوعیت اور مقاصد کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مغربی ممالک میں گوشت کا مسئلہ

جو مسلمان یورپ و امریکہ وغیرہ جاتے ہیں۔ اُن کو اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ وہاں ان ممالک میں ایک خاص انداز سے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قسم کا ذبیحہ اسلام کے نزدیک جائز ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں مولانا کا کہنا ہے کہ اس سوال کا جواب دو باتوں پر غور کرنے کے بعد ہی سامنے آسکے گا۔

۱- جانور اللہ کے نام کے بغیر ذبح کیا جائے۔

۲- ذبح کرنے کا طریقہ مشینی ہے جو اسلام کے ذریعہ تسلیم شدہ طریقہ سے بالکل مختلف ہے۔

پہلی بات کے سلسلے میں مولانا نے امام ابوحنیفہ کی رائے نقل کی جن کے نزدیک اللہ کا نام لیے بغیر جانور کا ذبح کرنا قطعاً ناجائز ہے اور اپنی اس دلیل کے لیے امام ابوحنیفہ نے قرآن کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے وہ نقل کی ہے کہ ”اور جس جانور پر (ذبح کرتے وقت) اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا جائے اس کو مت کھاؤ اور اس کا کھانا فسق ہے“ (الانعام: ۱۲۱)۔^(۲۵) پھر آپ نے اس کے بالمقابل امام شافعی کا قول نقل کیا ہے۔ اُن کے نزدیک صرف اُس جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس کو اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لے کر ذبح کیا جائے۔ جب کہ وہ جانور جس کے ذبح کرتے وقت کسی کا نام نہ لیا گیا ہو، نہ اللہ کا نہ کسی دوسرے کا اس کو کھانا اُن کے نزدیک جائز ہے۔^(۲۶) امام شافعی نے اس مسئلے پر کئی قرآنی آیات کو بطور دلیل پیش کیا ہے^(۲۷) کہ صرف ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے جس کو ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ جس

۲۵- ایضاً، ص ۶۰۵

۲۶- ایضاً

۲۷- سورة البقرہ: ۷۳ اور سورة الانعام: ۱۲۵ کی کچھ آیات میں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جانور ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا ضروری ہے۔ اُن میں ایک آیت مندرجہ آیت سورة الانعام: ۱۲۱ ہے جس میں ’وانہ لفسق‘ کے الفاظ ہیں یعنی ایسے گوشت کا کھانا فسق ہے جبکہ انہی الفاظ (وانہ لفسق) کے ساتھ سورة الانعام: ۱۲۵ بھی ہے جس میں ایسے جانور کا گوشت کھانا فسق بتایا گیا ہے جس کو اللہ کے نام کے علاوہ کسی دوسرے کے نام پر ذبح کیا گیا ہو کیونکہ دونوں جگہ فسق کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے اس لیے امام شافعی کہتے ہیں کہ صرف اُن جانوروں کا گوشت کھانا جن پر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا نام لیا گیا ہو حرام ہے۔ ایضاً، ص ۶۰۶

کے نتیجے میں باقی دو صورتوں میں گوشت حلال رہے گا۔^(۲۸) اس مسئلے پر مولانا اکبر آبادی نے امام شافعی کے قول کی تائید کی ہے اور اس پر عمل کرتے ہوئے آپ کا کہنا ہے کہ جہاں تک پہلے معاملے کا تعلق ہے، یورپ و امریکہ میں ذبح کیے گئے جانور کا گوشت حرام نہیں رہے گا۔^(۲۹) جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے اس ضمن میں آپ کا فرمانا ہے کہ علماء کو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اسلام کی پوری تاریخ میں اب تک مسلمان جس طریقے سے جانور کو ذبح کرتے چلے آ رہے ہیں، وہ کیا مذہبی اقدار میں سے کوئی قدر ہے یا محض رسم و رواج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس کی حیثیت صرف رسم و رواج کی ہے اور اس کے پیچھے قرآن کی صریح دلیل نہیں ہے تو ایک دوسرا بہتر اور زیادہ ترقی یافتہ طریقہ اپنانے سے شرعی حدود کی خلاف ورزی نہیں سمجھی جائے گی۔^(۳۰) یہ صحیح ہے کہ مولانا نے ذبح کے طریقے میں ایک چکدار طریقہ اختیار کیا ہے تاہم اُس طریقے کو بھی شریعت سے مشروط کر دیا ہے۔

عورتوں کی عوامی سرگرمیوں میں شرکت

مولانا اکبر آبادی نے جدید علمی و سائنسی ترقی کی دوڑ میں خواتین کی شمولیت و شرکت کی حمایت کی ہے اور اس کی توجیہ بھی پیش کی ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ مسلم عورتیں ماضی میں الگ تھلگ زندگی گزارتی رہی ہیں، چاہے پردہ ہو یا نہ ہو۔ اسے ماضی میں کتنا ہی اچھا کیوں سمجھا جاتا رہا ہو، موجودہ حالات میں مسلمانوں کا اس سے گریز ان کے لیے نقصان دہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جب تمام اقوام ترقی کے میدان میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں شریک ہوں اس قوم کے لیے ترقی ممکن نہیں ہے جس کی آدھی آبادی مرکزی دھارے سے کٹ جائے۔ تعلیم، طب (میڈیسن) اور کسی حد تک قانون (فقہ) ایسے میدان ہیں جن میں ہماری بہنیں اور بیٹیاں شرکت کر سکتی ہیں۔ ان میدانوں میں شرکت نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی ہے اور اسلامی قانون میں پسندیدہ بھی ہے۔^(۳۱) تاہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید درست نہ ہوگا کہ مولانا عورتوں کی مادر پدر آزادی اور مخلوط اجتماع کے حامی ہیں۔^(۳۲)

۲۸- ایضاً

۲۹- ایضاً

۳۰- ایضاً

۳۱- ایضاً، ص ۶۰۴-۶۰۵

۳۲- اس کے لیے مولانا اکبر آبادی کا یہ مضمون ملاحظہ ہو :

خواتین اسلام، مشمولہ: بزم ہان، دہلی، جلد ۹۱، شمارہ ۳ (اکتوبر ۱۹۸۳ء)، ص ۲۲۲ تا ۲۲۸

جمع بین الصلاتین

جس وقت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرض الموت میں علیل ہو کر بستر تک محدود ہو گئے تھے تو آپ نے نمازوں میں حنفی فقہ کے برخلاف امام ابن تیمیہ کا اتباع کیا اور جمع بین الصلاتین کا اہتمام کیا۔ یعنی آپ نے اہل حدیث کے مسلک کے مطابق دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کیا۔ یہ واقعہ مولانا کے فقہی توسُّع اور اعتدال پسندی کا ایک اور مظہر ہے۔ (۳۳)

تعدد ازدواج

مولانا اکبر آبادی نے تعدد ازدواج کے مسئلے پر بھی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں گفتگو فرمائی ہے۔ اس مسئلے پر آپ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت صرف بطور رعایت دی گئی ہے کیونکہ آپ کے نزدیک اُس وقت کے حالات کے تحت ایسا کرنا ضروری تھا۔ (۳۴) لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ یہ مد نظر رہے کہ یک زوجگی (ایک وقت میں ایک بیوی رکھنے کے اصول) کی اجازت قرآنی نقطہ نظر سے عام ہے جبکہ تعدد ازدواج کی اجازت صرف بطور رعایت دی گئی ہے۔ اس کے لیے مولانا سورۃ الانساء: ۳ کی آیت بیان کرتے

۳۳- محمد اسلم، وفیات۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی رحلت، مشمولہ: معارف، اعظم گڑھ: دار المصنفین، جلد ۱۳۵، شمارہ ۶ (جون ۱۹۸۵ء)، ص ۴۶۲

۳۴- مولانا سعید احمد اکبر آبادی امیر علی کی کتاب، دی اسپرٹ آف اسلام کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اسلام سے قبل نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی تعدد ازدواج پر عمل کیا جاتا تھا۔ کیونکہ:

۱- اسلام سے قبل لوگ عام طور پر حالت جنگ میں رہتے تھے۔ مسلسل جنگ و پیکار کی وجہ سے آدمیوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔ عورتوں کے سر پرستوں اور نگہداشت کرنے والوں کی کمی کی وجہ سے ان کو خستہ حالی اور محتاجگی کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے تعدد ازدواج کو زیادہ فروغ ہوا۔

۲- اسلام کو ابتدائی تاریخ میں ان ہی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ مسلمان اپنے دشمن سے جو کہ اُن کو مٹانے پر تلا ہوا تھا، ان سے مستقل حالت جنگ میں رہے۔ عورتیں اپنے محبوب شوہروں سے اور بچے اپنے پیارے والدوں سے محروم ہو گئے، اسلام کو ان مسکین اور یتیموں کی مشکلات کا حل تلاش کرنا پڑا۔

۳- ان ہنگامی حالات کی وجہ سے ہی اسلام کو اس بات کی اجازت دینی پڑی کہ ایک آدمی ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ ہنگامی حالات اجتماعی اور انفرادی دونوں قسم کے تھے۔ مثلاً کسی عورت کا کوئی ایسا جسمانی نقص جس کی وجہ سے وہ اپنے شوہر کی جنسی خواہشات پوری نہ کر سکے یا وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔ دو درجہ جدید میں اسلامی قانون، حوالہ سابقہ جلد ۸۷، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۸۱ء)، ص ۵۸۸-۵۸۹

ہیں، جس میں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے۔^(۳۵) لیکن مولانا واضح کرتے ہیں کہ تعددِ ازواج کی مندرجہ بالا اجازت بھی غیر مشروط نہیں ہے۔ اس میں بھی عدل و مساوات کی شرط ہے۔ اس ضمن میں مولانا نے تعددِ ازواج کی اجازت کا غلط طریقے پر استعمال کیے جانے کی طرف بھی نشاندہی کی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں ایک اہم بات یہ ہے کہ تعددِ ازواج کا شمار احکامات کی ایک خاص قسم یعنی مباحات میں ہوتا ہے۔ اس طرح دوسرے مباحات کی طرح تعدادِ ازواج میں جہاں کہیں خوبیاں ہیں وہاں افراط و تفریط کی وجہ سے اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جب کسی مباح کو ذاتی اغراض پورا کرنے کی وجہ سے غلط استعمال کیا جانے لگے اور اس کی وجہ سے اخلاقی و معاشرتی اقدار متاثر ہوتی ہوں تو اسلامی اسٹیٹ یا مسلمانوں (کے نظمِ اجتماعی) کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس میں مداخلت کرے اور اس کو عارضی طور پر روک دے یا کچھ پابندیاں عائد کر دے جیسا کہ خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے بہت سے فیصلوں سے اس نقطہ نظر کو مزید تقویت ملتی ہے۔^(۳۶)

اس گفتگو کی روشنی میں جو چند اہم نکات سامنے آئے ہیں، مولانا جس کی طرف ایک مجتہد کی توجہ مبذول کراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان نکات کو سامنے رکھ کر ایک مجتہد ایک نتیجہ نکال سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعددِ ازواج کی شرعاً اجازت ہے لیکن اس مسئلے کی اباحت کے سلسلے میں اسلام کی عائد کردہ کچھ قیود و پابندیاں ہیں۔ دنیا میں انسانوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد، دیگر معاشی اور معاشرتی مسائل کی وجہ سے اسلامی اسٹیٹ یا اُس کی غیر موجودگی میں خود مسلمان اگر ایسا مناسب سمجھتے ہوں تو اس عمل پر کچھ پابندیاں

۳۵۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، ترجمہ: ”اور اگر تم کو ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں کا حق برابر نہ دے سکو گے تو (دوسری غیر) جو عورتیں تم کو بھلی لگیں اُن سے نکاح کر لو دو دو، تین تین، چار چار (یعنی دو سے لے کر چار تک) پھر اگر تم کو (کئی عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے میں) ڈر ہو کہ برابر انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر قناعت کرو یا لونڈی پر۔ یہ ظلم سے بچنے کی زیادہ نزدیک راہ ہے۔ ایضاً، ص ۵۸۹-۵۹۰

۳۶۔ اس سے متعلق مولانا اکبر آبادی حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگرچہ مسلمان اہل کتاب عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن جب حضرت عمرؓ کو یہ معلوم ہوا۔ کہ یہ عمل معاشرے میں بہت عام (مقبول) ہوتا جا رہا ہے، تو انہوں نے یہ فرمایا: گو کہ مجھے کسی حلال چیز کو حرام یا حرام چیز کو حلال کرنے کا اختیار نہیں ہے لیکن مجھے اس کی ضرورت ہے تم اگر رومی لڑکیوں کی خوبصورتی پر اس طرح ریتھتے رہے۔ تو عرب کی کنواری لڑکیوں کا کیا حال بنے گا۔ لہذا حضرت عمرؓ نے اس مباح کو عارضی طور پر روک دیا۔ ایضاً، ص ۵۹۵-۵۹۱

عائد کر سکتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے اخلاقی اور معاشرتی اقدار متاثر نہ ہوں۔ (۳۷)

فیملی پلاننگ

فیملی پلاننگ یا سادہ الفاظ میں برتھ کنٹرول (ضبط تولید) اُن مسائل میں سے ہے جن پر گرم جھیش اور پُر زور دلائل کے ساتھ مذاکرات ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس مسئلے پر بھی گفتگو کی ہے۔ آپ کا فرمانا ہے کہ یہ مسئلہ بہت آسان ہے اور اتنا پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے جتنا کہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے آپ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ اسلام میں شادی کا مقصد صرف جنسی خواہشات کو (جائز طریقہ سے) پورا کرنا ہی نہیں جو کہ اپنی جگہ بہت ضروری ہے۔ بلکہ انسانی آبادیوں کی نشوونما اور اس کی تعداد میں اضافہ بھی ہے۔ اسی لیے برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی عام حالات میں اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن ایک فطری مذہب ہونے کی حیثیت سے اسلام واقعی صورتِ حال اور زندگی کے اُن حقائق سے جو کسی قوم کو درپیش ہوں کنارہ کشی اختیار کر کے آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ آپ کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں جو روایات بیان ہوئی ہیں، ان میں باہم تناقض ہے۔ عرب میں برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کے لیے عام طور پر عزل کے طریقے پر عمل کیا جاتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ احادیث میں عزل کے سلسلے میں ممانعت آئی ہے۔ لیکن اس کے برخلاف بخاری میں حضرت جابرؓ نے ایک روایت میں فرمایا کہ ”ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عزل کرتے اور وحی (بشکل قرآن) نازل ہوتی تھی۔“ (۳۸) اس کی روشنی میں مولانا نے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ (i) برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی اجازت بغیر کسی معقول عذر کے نہیں دی جاسکتی لیکن کسی حقیقی اور معقول وجہ سے برتھ کنٹرول (ضبط تولید) کی اجازت نہ صرف دی جاسکتی ہے بلکہ کبھی کبھی یہ عمل ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ البتہ محض اغراضِ نفسانیہ کو پورا کرنے اور دل بہلانے کے مقصد سے اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ (۳۹)

اس ضمن میں مولانا دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ (i) پہلے یہ کہ یہ شوہر و بیوی کے درمیان ذاتی و نجی معاملہ ہے اور اس سلسلے میں وہ (شرعی حدود کے اندر) مناسب تدابیر اختیار کرنے کے مجاز ہیں۔ اسلام کے مطابق کسی گورنمنٹ کو اس میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔ (ii) دوسرے یہ کہ برتھ کنٹرول

۳۷ - ایضاً، ص ۵۹۱

۳۸ - ایضاً، ص ۵۹۳

۳۹ - ایضاً

(ضبط تولید) کے سلسلے میں استعمال کی گئی تدبیر صحت کے لیے کم سے کم مضر ہونا چاہیے۔^(۴۰)

خواتین کا پردہ

پردہ نسواں کے حوالے سے آپ نے اپنا یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے کہ چہرہ اگرچہ ستر میں داخل نہیں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ کشفِ وجہ مطلقاً جائز ہو، کیونکہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے اس کے احکام تبدیل پذیر ہیں۔^(۴۱) اگرچہ مولانا اکبر آبادی پردہ نسواں کو ایک معاشرتی مسئلہ کہتے ہیں لیکن یہ مسئلہ کس حد تک معاشرتی ہے اور کس حد تک دینی، آپ نے اس کی بحث سے گریز کیا ہے تاہم مولانا یہ بھی فرماتے ہیں کہ حج کے سلسلے میں شریعت کا صاف حکم ہے کہ عورت کا احرام ہی چہرہ کھلا رکھنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض خواتین برقع کی ٹوپی میں ایک چھجا لگا لیتی اور اس سے نقاب لٹکالیتی ہیں تاکہ چہرہ بھی کھلا رہے اور کوئی اسے دیکھ بھی نہ پائے۔ مولانا کے نزدیک اس قسم کی رسم پرستی دینداری ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ سرتاسر اتباعِ ہوا اور اعجابِ کل ذی رأی برأیہ (ہر رائے دینے والا اپنی بات کو اہمیت دے) ہے جس پر شدید وعید خداوندی ہے۔^(۴۲) پردہ نسواں سے متعلق مولانا کا موقف اگرچہ خاصا چکدار ہے اور ایک معاشرتی و تمدنی مسئلہ کے طور پر اسلامی اور مغربی ممالک میں حساس تنازعہ کی صورت بھی اختیار کر چکا ہے تاہم مولانا کشفِ وجہ کو مطلقاً جائز قرار نہ دے کر بالواسطہ طور پر چہرہ کے پردہ کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

گائے کی قربانی

گائے کی قربانی کا مسئلہ ہندوستان میں ہمیشہ سے دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں میں کشیدگی اور کشاکش کا سبب بنا رہا ہے۔ ملک کی تقسیم جن حالات میں ہوئی ہے ان کی وجہ سے اس کی نزاکت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ چونکہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے اس لیے مولانا اکبر آبادی سمجھتے ہیں کہ یہ علماء کا فرض تھا کہ تقسیم کے بعد ہی فوراً اس کے متعلق کوئی متفقہ فیصلہ کر کے مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تاکہ گومگو کے عالم میں رہنے کے باعث جان و مال کا جو خسارہ مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے اس سے نجات ملتی اور صورتِ حال کا کوئی خوشگوار حل نکل سکتا۔ چنانچہ مولانا اکبر آبادی نے علماء کی اس خاموشی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔

۴۰- ایضاً، ص ۵۹۳

۴۱- ایضاً، نظرات، حوالہ سابقہ، جلد ۸۵، شمارہ ۱ (جولائی ۱۹۸۵ء)، ص ۸۰

۴۲- ایضاً

کیونکہ آپ کے نزدیک اگر اب بھی اس کا کوئی حل نہ نکالا گیا تو اس کے نتائج انتہائی خطرناک اور افسوسناک ہوں گے۔ چنانچہ اس مسئلہ کی نزاکت کے پیش نظر آپ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جہاں تک اس مسئلے کی شرعی حیثیت کا تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ گائے کی قربانی نہ فرض ہے اور نہ واجب بلکہ مباح ہے، جس میں اخذ اور ترک کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہوتا ہے۔ پھر اس میں شبہ نہیں کہ کبھی خارجی اور بیرونی حالات کے باعث کسی امر مباح کا کرنا واجب بھی ہو جاتا ہے اور کبھی ممنوع بھی اور ان حالات کی تشخیص و تعیین اگر مسلمانوں کی حکومت ہو تو حکومت کا کام ہے اور وہ بھی علما کے مشورے سے ورنہ یہ صرف علماء کا کام ہے۔ (۳۳)

آپ مسلمانوں کو اس مسئلہ پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے قطع نظر کہ موجودہ حالات میں ہندوؤں کی پوزیشن کیا ہے اور مسلمانوں کی کیا، نفسِ مسئلہ کی حیثیت سے اس پر غور کرنا چاہیے کہ (i) گاؤ کشی سببِ نزاع ہے یا نہیں؟ (ii) اگر سببِ نزاع ہے تو کیا مسلمان اس کی مقاومت کر سکتے ہیں؟ (iii) اگر مقاومت نہیں کر سکتے تو کیا از روئے احکامِ اسلام مسلمان اس سببِ نزاع کو دفع و ختم کر سکتے ہیں؟ (۳۴) ان تین سوالوں کے پیش نظر آپ کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں گاؤ کشی آج سے نہیں ہمیشہ سے سببِ نزاع بنی رہی ہے۔ لیکن تقسیمِ ہند سے قبل چونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی طاقت متوازن تھی اس لیے مسلمان اس کی مقاومت کر سکتے تھے۔ تقسیم کے بعد صورتِ حال یہ ہے کہ اس کا سببِ نزاع ہونا تو شدید سے شدید تر ہو گیا ہے اور دوسری جانب مسلمانوں میں تابِ مقاومت نام کو بھی نہیں رہی ہے۔ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ اب سوچنا یہ ہوگا کہ مسلمان باختیار خود اس کو ترک کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو شریعت کہتی ہے کہ ہاں مسلمان اس کو ترک کر سکتے ہیں اب لامحالہ شریعت کا حکم یہ ہی ہوگا کہ اجتماعی طور پر اس کے ترک کردینے کا اعلان کر دینا چاہیے۔ (۳۵) لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر کوئی گروہ مسلمانوں سے پوچھے بغیر اس حکم کو مسلمانوں پر زبردستی نافذ کرے اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کے جذبے سے تو ان مسلمانوں کے لیے اس کا حکم دوسرا ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر مسلمانوں کے لیے ممکن ہے تو اس کی مقاومت کرنی چاہیے ورنہ جبر

۳۳- ایضاً، جلد بست و پنجم، شمارہ ۴ (اکتوبر ۱۹۵۰ء)، ص ۵

۳۴- ایضاً، جلد بست و پنجم، شمارہ ۶ (دسمبر ۱۹۵۰ء)، ص ۳۲۴

۳۵- ایضاً

تو بہر حال ہوگا ہی۔ (۳۶)

انسدادِ گاوِ کشی اور تعددِ ازدواجِ مداخلت فی الدین ہے یا نہیں

اس حوالے سے مولانا کہنا ہے کہ اگرچہ تعددِ ازدواج اور گاوِ خوری دونوں کی حیثیت یکساں ہے، دونوں اسلام میں نہ فرض ہیں اور نہ واجب، بلکہ مباح ہیں۔ اگر حکومت ان دونوں کی بندش سے متعلق کوئی قانون بناتی ہے تو گاوِ خوری کی بندش مداخلت فی الدین ہرگز نہیں۔ لیکن تعددِ ازدواج کی بندش مداخلت فی الدین ہوگا۔ (۳۷) آپ اپنے اس نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس پر مباح کا لفظ بولا جائے تو اس کی ممانعت کو مداخلت نہیں کہا جاسکتا ورنہ آپ اس دنیا میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتے اور اپنی اصلاح و ترقی کے لیے کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ اس لیے جو چیزیں فقہی اصطلاح میں مباح کہلاتی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جن سے کسی قسم کی کوئی مصلحتِ دینی وابستہ نہیں ہے اور ان سے قربت کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری قسم ان چیزوں کی ہے جن کے مباح ہونے سے شریعت کی کسی بنیادی اغراض اور مقصد کی تکمیل میں مدد ملتی ہے۔ اور اس بناء پر اس پر نتیجتاً عذاب و ثواب کا ترتب ہوتا ہے اور یہ اس کی دلیل ہے کہ اس میں قربت کے معنی پنہاں ہیں۔ (۳۸) اس کی روشنی میں مولانا کہنا ہے کہ گاوِ خوری پہلی قسم کے مباحات میں داخل ہے کیونکہ اس کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ اس حوالے سے آپ علامہ جلال الدین سیوطی کی کتاب ”الرحمة فی الطب والحکمة“ (ص ۸) سے آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ”گائے کا گوشت داء یعنی بیماری اور اس کا دودھ اور گھی شفا ہے۔“ (۳۹) اس کی روشنی میں مولانا کہتے ہیں کہ اگر حضور صلی ﷺ کی طرف سے اس قول کی نسبت صحیح ہے تو پھر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاملہ میں جانِ نفی ہی قابلِ ترجیح ہوگی۔ لہذا آپ کا کہنا ہے بہر حال گاوِ خوری پہلی قسم کا مباح ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ اس کی بندش مداخلت فی الدین نہیں ہے۔ (۵۰)

جبکہ تعددِ ازدواج کے معاملے میں مولانا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے اگرچہ فقہی طور

۳۶ - ایضاً، جلد ۷، شماره ۳ (اپریل ۱۹۷۵ء)، ص ۱۹۸

۳۷ - ایضاً، جلد ۵۸، شماره ۱ (جنوری ۱۹۶۷ء)، ص ۳

۳۸ - ایضاً، ص ۲-۳

۳۹ - ایضاً، ص ۳

۵۰ - ایضاً

پر اس پر بھی اطلاق لفظ مباح کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ مباح کی دوسری قسم میں شامل ہے اور اس کی اباحت ایک اہم دینی مقصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہے^(۵۱) چنانچہ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ کوئی شبہ نہیں اسلام کا یہ قانون خاص خاص حالات میں پاکبازی اور صحتِ دل و دماغ اور آسودگی نظر کا کفیل و ضامن ہے۔ اب اگر کوئی حکومت خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ایسا قانون بناتی ہے جس کے ماتحت مسلمان اس اباحت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تو اس کا حل بجز اس کے کچھ نہ ہوگا کہ مسلمان ان سہولتوں سے محروم ہو جائیں گے جو ایک امر جنسی کی حالت میں اطمینان و سکون اور پاکبازی کی زندگی بسر کرنے کے لیے اُن کے دین نے فراہم کی ہیں۔ لہذا آپ کا کہنا ہے یہی حقیقت ہے مداخلت فی الدین کی، تعدد ازدواج کی اجازت قرآن میں مطلق نہیں بلکہ مشروط ہے۔ لہذا اس بناء پر ایک اسٹیٹ کو اس بات کی نگرانی کرنے کا تو حق ہے کہ وہ شرط پوری ہو رہی ہے یا نہیں؟ لیکن تعدد ازدواج کو بالکل ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا۔^(۵۲)

رؤیتِ ہلال:

رؤیتِ ہلال ایک خالص دینی مسئلہ ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی عبادات سے ہے تاہم رؤیتِ ہلال کے

۵۱- مولانا کہتے ہیں فرض کیجئے ایک شخص ہے جس کی بیوی بانجھ ہے اور اُس کو اولاد کی تمنا ہے جو ہر شخص کو طبعی طور پر ہوتی ہے یا وہ بیمار ہے اور اس کی بیماری لا علاج ہے یا اس کے اور بیوی کے مزاج میں اتحاد اور موافقت نہیں ہے، جس کے باعث اُس کی زندگی اجیرن بنی ہوئی ہے اور وہ درد و کرب کی زندگی گزار رہا ہے؟ اب سوچئے ان حالات میں بدنصیب شوہر کیا کرے؟ اگر اس بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لے تو اس کی انسانیت، شرافت، اور غیرت گوارہ نہیں کر سکتی کہ جو عورت اتنے زمانے تک اُس کی رفیقہ زندگی بنی رہی ہے اُس کو یوں ایک ایسے امر کے باعث جس میں عورت کو کوئی دخل نہیں خانہ بدر کر کے روٹیوں کا محتاج بنا دے۔ اس بناء پر اب اس شخص کے سامنے صرف دو ہی صورتیں ہیں یا انسانیت اور شرافت کو بالائے طاق رکھ کر اس بیوی کو طلاق دے اور دوسری شادی کر لے اور یا بہر صورت اسی ایک بیوی پر قانع رہ کر عمر پر اسی آگ میں جلتا رہے۔ اسلام میں تعدد ازدواج کی اباحت کا قانون اس شخص کی مدد کرتا ہے اور ایک ایسی درمیانی صورت پیدا کر دیتا ہے کہ پہلی بیوی بے سہارا اور بے یار و مددگار نہیں ہوتی اور خود اس کی اپنی زندگی بھی اجیرن نہیں ہوتی اور حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کی مصیبت اور مشکل کا حل اس سے بہتر کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ اب اگر قانون اس شخص کو عقدِ ثانی سے روکتا ہے تو اس کے معنی بالواسطہ یہ ہیں کہ یہ شخص ہر ہچکاری ہو کر رہے جو ایک تندرست انسان کے لیے قطعاً غیر طبعی فعل ہے اور یا شہد کی مکھی بن کر زندگی کے دن گزارے کہ ہر روز ایک نیا آستاں، نیا سنگِ در اور نئی جبینِ نیاز/ ایضاً، ص ۳-۴

موضوع پر بحث و تحقیق ایک روایت بن گئی ہے خصوصاً پاکستان میں ہر سال رمضان اور عید الفطر کے موقع پر رویتِ ہلال کا معاملہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اس مسئلے پر مولانا اکبر آبادی نے بھی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ آپ اپنی گفتگو کا آغاز امام ابو حنیفہؒ کی اس مسئلے پر رائے نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شک امام ابو حنیفہ کی رائے یہی ہے کہ رویتِ ہلال میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں لیکن اس سے یہ مراد لینا کہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی رویت ثابت ہو جائے تو ساری دنیا میں اس کے مطابق عمل ہوگا اور ہر جگہ رویت تسلیم کی جائے گی، آپ کے نزدیک یہ ایک ایسی ناقابلِ فہم اور لغو بات ہے جسے کم از کم موجودہ زمانہ کا کوئی پڑھا لکھا آدمی تسلیم نہیں کر سکتا۔ پھر امام عالی مقام کا اس قول سے یہ مطلب کس طرح ہو سکتا ہے۔ (لوگوں نے امام صاحب کا مطلب غلط سمجھا ہے) اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ اصل میں دیکھنا یہ چاہیے کہ شریعت کا حقیقی منشاء اور اس سلسلہ میں ارشاد نبوی ﷺ کیا ہے اور اس کی روح کیا ہے۔ (۵۳) اس نقطہ نظر سے غور کرنے کے بعد مولانا دو باتیں بیان کرتے ہیں:

- ۱- اوّل یہ کہ روزہ اور اس کے افطار کا دارومدار صرف رویتِ ہلال پر ہوگا، شمسی حساب یا کسی اور حساب پر ہرگز نہیں ہوگا۔
- ۲- رویتِ دو قسم کی ہے:
 - ۱- حسی اور ظاہری
 - ۲- معنوی اور معہود (۵۴)

اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ ظاہری رویت تو کھلی ہوئی رویت ہے۔ اس کے متعلق کسی بحث و گفتگو کی ضرورت نہیں۔ البتہ معنوی رویت کے معنی یہ ہیں کہ طول البلد اور عرض البلد کے حساب سے کسی ایک مقام پر بھی خواہ ان میں مسافت اور بُعد کتنا ہی ہو، رویت ہونی چاہیے۔ مگر کسی سبب سے نہیں ہوئی۔ ایسی صورت میں آپ آنحضرت ﷺ کا مشہور ارشاد نقل کرتے ہیں ’صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ فان غم علیکم فاقدروا لہ‘ ترجمہ: چاند دیکھ کر روزہ رکھا کرو اور چاند دیکھ کر عید منایا کرو اگر مطلع ابر آلود ہو تو اندازہ کر لیا کرو۔ اس حوالے سے عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت مروی ہے اس کے بارے میں مولانا کا کہنا ہے

۵۳- ایضاً، جلد ۶۶، شمارہ ۶ (جون ۱۹۷۱ء)، ص ۳۶۶

۵۴- ایضاً، ص ۳۶۶-۳۶۷

کہ اس میں بجائے ”فاسقدروالہ“ کے فاسکملوا العدة ثلاثین (یعنی اگر مطلع ابر آلود ہو تو تمیں کی گنتی پوری کر لیا کرو) کے الفاظ ہیں۔ علماء نے ان دونوں میں تضاد سمجھا ہے۔ (۵۵) جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ ہمارے نزدیک دونوں قول صحیح ہیں اور ان کا محمل الگ الگ ہے۔ یعنی اگر فضا ابر آلود ہے اور کہیں سے رویت کی خبر نہیں آئی ہے تو تمیں دن پورے کر لینے چاہئیں۔ لیکن اگر کہیں سے خبر آگئی ہے تو تم حساب لگا کر دیکھو کہ یہاں چاند ہو سکتا تھا یا نہیں! اگر حساب سے معلوم ہو کہ مقام رویت سے عرض البلد میں اشتراک یا قرب کے باعث یہاں بھی رویت متحقق ہو سکتی تھی تو بس اب صرف خبر کے متعلق تحقیق کر لو کہ وہ کیسی ہے؟ اگر عرف عام میں اس طرح کی خبر کو سچا سمجھا جاتا ہے تو زیادہ کج و کا د کی ضرورت نہیں، اس خبر کی بنیاد پر تم بھی رویت تسلیم کر لو۔ ایسی صورت میں آپ کے نزدیک ٹیلی فون اور ریڈیو کی خبر کا اعتبار چند شرائط کے ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن جس مقام پر رویت نہیں ہوئی ہے تو آپ کا کہنا ہے کہ اس مقام پر ازروئے حساب چاند کا مرئی ہو سکتا ایک امر قطعی ہونا چاہیے۔ لہذا اس کی روشنی میں مولانا کے نزدیک اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ساری دنیا میں ایک ہی دن رمضان یا عید کرنے کا جذبہ شریعت میں ہرگز ناقابل عمل ہے اور نہ مستحسن! بلکہ یہ ایک ایسی بدعت ہے جس سے اسلام بڑی ہے۔ اس بناء پر آپ کا کہنا ہے کہ جن دو ملکوں میں غروب آفتاب کا فصل تین چار گھنٹہ ہو ان میں ایک کی رویت دوسرے کے لیے کس طرح حجت بن سکتی ہے۔ (۵۶)

جمعہ تعطیل

مولانا سعید احمد اکبر آبادی جمعہ کی تعطیل کے بجائے اتوار کی تعطیل میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں سمجھتے۔ آپ کے اس نقطہ نظر کا اظہار نظرات کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے وائس چانسلر کے ایک سرکلر کی تائید میں کہی ہے کہ آئندہ جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل ہوگی۔ مولانا اس سرکلر کی تائید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اتوار کی چھٹی میں قابل اعتراض بات کیا ہے؟ ایک ایسا ادارہ جس کو اُن سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے روزمرہ واسطہ پڑتا ہو، جہاں تعطیل کا دن اتوار ہو، اس کے لیے تعلیمی اور انتظامی سہولت اسی میں ہے کہ اس کے ہاں بھی تعطیل کا دن اتوار ہی ہو۔ رہی جمعہ کی تعطیل تو اس کا حکم نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو قرآن کی سورہ جمعہ میں نماز جمعہ سے متعلق جو آیات

۵۵- ایضاً، ص ۳۶۷

۵۶- ایضاً، ص ۳۶۷-۳۶۸

ہیں ان سے تو بطور دلالت النص یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن تعطیل ہونی ہی نہیں چاہیے۔ آپ اپنی بات کے استدلال میں سورہ جمعہ کی آیت: ۹ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ”اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کے لیے اذان ہو جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت (یعنی کاروبار) چھوڑ دو“ مولانا کا کہنا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان سے قبل تک کاروبار کی اجازت تھی اور مسلمان کرتے بھی تھے پھر جب نماز ختم ہو جائے تو اب ارشاد ہے کہ تم اپنے اپنے کاروبار پر پہنچ جاؤ اور کسب معاش کرو۔ (۵۷) مولانا کہتے ہیں اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد بھی صرف اجازت نہیں بلکہ حکم ہے کہ اپنے اپنے دھندے سے جا کر لگو۔ لہذا جمعہ کے بجائے اتوار کو تعطیل کرنے میں کوئی قباحت اور مضائقہ نہیں۔ (۵۸)

غیر مسلم تقریبات

ہندوستان میں غیر مسلم تقریبات میں شرکت کے حوالے سے مسلمانوں کا جو عام ذہن اور انداز فکر بن گیا تھا یعنی کسی معاملے کے متعلق اس کے مختلف پہلوؤں کے تجزیہ و تحلیل کے بغیر ایک عام اور مطلق حکم لگا دینا۔ اس کا مظاہرہ اس مسئلے پر بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک فریق اس کو مطلقاً ناجائز کہتا ہے اور دوسرا جائز۔ چنانچہ اس مسئلے کے پیش نظر مولانا اکبر آبادی اس کی اصل حقیقت یہ بیان کرتے ہیں کہ تقریب مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی، اس کی دو حقیقتیں ہوتی ہیں، ایک مذہبی اور دوسری سوشل۔ (۵۹) اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں جو احکام پیدا ہوتے ہیں وہ چار قسم کے ہیں:

- ۱۔ تقریبات کی نوعیت اگر خالص مذہبی ہے تو اس میں شریک ہونا اور عبادت میں عملی حصہ لینا قطعاً حرام ہے۔
- ۲۔ اس نوعیت کی تقریبات میں صرف شریک ہونا اور عبادت یا پوجا پاٹ میں عملی حصہ نہ لینا اس کی دو قسمیں ہیں:

۵۷۔ ایضاً، جلد ۵۹، شمارہ ۵ (نومبر ۱۹۶۷ء)، ص ۲۵۹

۵۸۔ ایضاً

۵۹۔ مولانا کا کہنا ہے کہ مثلاً مسلمان عید مناتے ہیں تو اُس کی حیثیت تو یہ ہے کہ نماز پڑھتے ہیں تو یہ مذہبی ہے اور دوسری یہ ہے کہ تحفہ تحائف بھیجتے ہیں، دعوتیں کرتے ہیں۔ مبارکباد کے خطوط بھیجتے ہیں اور عید یونین پارٹیاں کرتے ہیں۔ بس یہی حل غیر مسلم تقریبات کا ہے۔ ایضاً، جلد ۵۸، شمارہ ۲ (فروری ۱۹۶۷ء) ص ۶۷

(الف) کسی تحقیق یا معلومات حاصل کرنے کی نیت سے شریک ہونا۔

(ب) اس طرح کی کسی نیت اور ارادہ کے بغیر محض تماشائی کی حیثیت سے شریک ہونا۔^(۶۰)

اس کی روشنی میں مولانا کا کہنا ہے کہ ان دونوں میں (ا) کا حکم یہ ہے کہ مباح ہے اور (ب) کا حکم یہ ہے کہ مکروہ ہے۔

۳- اب رہی تیسری قسم یعنی یہ کہ تقریب کی نوعیت مذہبی اور عبادتی نہیں بلکہ سوشل عصرانہ یا ڈنر وغیرہ کی صورت میں یا کلچرل ہے۔ یا ایک ایسے جلسہ کی صورت میں ہے جس میں اکابر مذہب کے حالات زندگی اور ان کے علمی اور اخلاقی کمالات پر تقریریں کی جائیں تو اس نوع کی تقریبات میں شریک ہونا صرف جائز نہیں بلکہ مستحب ہے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے تعلقات خوشگوار ہوتے ہیں اور محبت بڑھتی ہے۔ اسلام میں جس طرح مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی خوشگواہی مطلوب ہے، اسی طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی علاق و روابط کی خوشگواہی اور حسن معاشرت مرغوب ہے۔^(۶۱)

موجودہ زمانے کے مذکورہ بالا مسائل جن کے حل کے لیے مولانا نے فقہ اسلامی کی روشنی میں جو چند تجاویز پیش کیں، اس سے مولانا کا یہ نقطہ نظر سامنے آتا ہے کہ فقہ اسلامی ایک جامد، بے حرکت و غیر متحرک قانون نہیں ہے بلکہ متحرک اور تغیر پسند، قانون ہے جو پوری قوت اور اعتماد و بھروسہ کے ساتھ کسی بھی دور کے حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، خصوصاً دورِ حاضر میں جبکہ زمانے نے ایک نئی کروٹ لی ہے اور ہمارا معاشرہ ناگذیر اقتصادی و سیاسی اور معاشرتی عوامل کی بناء پر ایک عجیب و غریب روپ میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے بعض مسائل از سر نو فکر و عقل کی سطح پر ابھر آئے ہیں اور اس بات کے متقاضی ہیں کہ ان کی جانچ پڑتال کر کے شریعتِ اسلامی میں ان کو صحیح جگہ متعین کیا جائے۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر مطالبہ یہ ہو رہا ہے کہ فقہ کی ساری ترتیب ہی بدل دی جائے اور اس کو جدید ترین شکل میں پیش کیا جائے۔ فقہ کی نئی تدوین پر زور دینا دراصل اس بات پر زور دینا ہے کہ معاشرے کے موجودہ ڈھانچے کا جائزہ لیا جائے، جس کے کئی اجزاء بالکل فرسودہ ہو چکے ہیں اور موجودہ تقاضوں کے قریب ہو کر

۶۰- ایضاً

۶۱- ایضاً

دیکھا جائے کہ ان میں کتنا وزن ہے۔ کیا چیزیں ان میں اپنانے اور سمو لینے کی ہیں اور کتنی ایسی ہیں جن کو چھو نا بھی جائز نہیں۔ کیونکہ یہی جائزہ اور احتساب حیاتِ ملی کا واحد ضامن ہے۔^(۶۲) لہذا درحقیقت آج ہمیں اجتہاد کی جس قدر ضرورت ہے وہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور یہ ضرورت و اہمیت تاریخ کے ہر دور میں محسوس کی گئی ہے۔ تاہم اجتہاد کا مسئلہ ایک نازک مسئلہ ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ دین میں اجتہاد پر گفتگو کرنا ہر خاص و عام کا موضوع بن گیا ہے۔ خواہ وہ عوام ہوں یا خواص، علماء ہوں یا اسکالرز، ہر محفل و مجلس کا یہی موضوع سخن ہے اور ہر ایک اسی موضوع پر اپنی رائے زنی اور اپنے مخصوص نظر یہ کے مطابق اس کی تشریح و توضیح کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق جس قدر گفتگو زیادہ ہوتی ہے معاملہ اسی قدر پیچیدہ ہو جاتا ہے اور نفسِ موضوع کی وضاحت و تشریح رہ جاتی ہے اور اجتہاد کو عوام کے لیے ایک کھلی چھوٹ سمجھ لیا گیا ہے تاکہ وہ خدا کے دین میں اپنی من گھڑت باتیں کہہ سکیں اور شرعی امور میں اپنی من مانی رائے ظاہر کریں اور دین میں وہ چیز داخل کر دیں جس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو اور وہ چیز خارج کر دیں جو شارع اسلام پر نازل ہوئی ہے اور جس پر امت کا عمل رہا ہے اور یہ سب کچھ اجتہاد، تجدد اور تقاضائے زمانہ کی تقلید و اتباع میں کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب ہم ایک دوسرے نقطہ نظر کو دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنا الگ موقف ہی بنا لیا ہے جس کے سامنے نہ موجودہ دنیا کے حالات و مسائل ہیں اور نہ ہی اسلامی قانون کی لچک اور تغیر پذیر صورت ہے اور جو شریعت کو صرف دسویں صدی ہجری کی زبان و اصطلاح میں سمجھتی ہے اور اس کو جامد و معطل شکل میں پیش کرتی ہے، جس میں اجتہاد و توحیح کی قطعی طور پر کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ ان کی فہم و فراست کی آخری حد اور ان کا مبلغ علم فتویٰ کی بعض کتابوں اور چند فقہی نصوص سے زیادہ نہیں ہو تا، چنانچہ ان کے نزدیک تفقہ کا مطلب یہ ہے کہ فقہ کی سمجھ اور متاخرین کی آراء سے واقفیت حاصل ہو جائے، انہیں اس سے مطلب نہیں کہ فقہ کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ یہ دونوں نظریے ایک دوسرے کے رد عمل کا نتیجہ ہیں یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز سے ان دونوں انتہا پسند طبقوں کے درمیان بُعد بڑھتا گیا جو اب تک برابر قائم ہے اور علماء ان دونوں طبقوں میں بٹے ہیں۔^(۶۳) تاہم ان دونوں کے مددِ مقابل ایک جماعت ترقی پسند علماء کی بھی ہے جو حالات و تقاضے کی روشنی میں قدیم چیزوں کی نئی ترتیب و تہذیب چاہتی ہے اور جو اس حقیقت سے واقف ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو معقول المعنی ہے اور ایسی فقہی بنیادوں پر

۶۲۔ محمد حنیف ندوی، مسئلہ اجتہاد، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۴ء ص ۲۰۹-۲۱۰

۶۳۔ عبدالمبین ندوی، (مترجم) دورِ حاضر میں اجتہاد اجماعی، مشمولہ: مُد بان، جلد ۹۶، شمارہ ۳ (مارچ ۱۹۸۶ء) ۵۱ تا ۵۳

استوار ہے کہ جن پر ہر دور اور ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق نئی نئی عمارتیں قائم کی جاسکتی ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں ماضی میں بھی محدثین اور فقہانے برابر اپنے وقتوں میں اُن مسائل اور عملی مشکلات سے تعرض کیا جو ان کے سامنے آئیں۔ (۶۳) آج جبکہ مسائل روز بروز بڑھتے اور مختلف ہوتے جاتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ لہذا فقہ کی جدید تدوین اسی طبقے کی آواز ہے تاکہ وہ مسائل جو اسلامی شریعت کی روشنی میں حل طلب ہیں اُن کا حل اسلامی نقطہ نظر سے تلاش کیا جائے۔ یہی وہ بات ہے جس کی طرف مولانا اکبر آبادی نے اشارہ کیا ہے اور اپنا تعلق اسی ترقی پسند علماء کی جماعت سے قرار دیا۔

دوسری بات مذکورہ مطالعہ سے ہمیں جو نظر آتی ہے، وہ مولانا کے فقہی خیالات میں اعتدال و توازن ہے۔ آپ نے اختلافی مسائل و فقہیات میں وسعت و رواداری، اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور کسی ایک فقہ پر جمود و اصرار کرنے کے بجائے بلا امتیاز تمام فقہی مکاتب سے استفادہ کیا۔ آپ کا یہی وہ مسلک توُّسُح تھا جس کی وجہ سے وہ ہر اُس دعوت و تحریک کی حوصلہ افزائی فرماتے، جس میں فقہی رواداری ہوتی اور اس کی بنیاد کسی ایک فقہ پر جمود کی بجائے بلا امتیاز تمام فقہی ذخیروں سے استفادہ پر ہوتی۔ (۶۵)

اگرچہ مولانا اکبر آبادی خود حنفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے مگر انہوں نے دوسرے مسالک کے لیے غیر معمولی فراخ دلی کا اظہار اور احترام کیا۔ یہ خصوصیت ہمیں آج کل کے علماء میں بہت کم نظر آتی ہے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ مذہبی علماء اور اسکالرز اپنے مسلک و افکار میں بے چلک ہوتے ہیں اور اپنے مکاتب فکر کے مقابلے میں کوئی سمجھوتہ قبول نہیں کرتے جبکہ مولانا کا مسلک اس کے بالکل برعکس ہے۔

نیز مذکورہ مطالعے میں آپ کے نزدیک فقہی اقوال و آراء کے مقابلے میں نصوص قرآن کو جو برتری حاصل ہے وہ بھی نظر آتی ہے۔ انہوں نے مختلف اُمور و مسائل میں قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کیا، بجائے اس کے کہ حنفی مسلک کے مسلمہ اُصولوں کو پیش نظر رکھا ہو۔ اس کی تائید ہمیں مولانا کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ خود اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ "میرے نزدیک کوئی چیز قدیم ہو یا جدید اُس کے حسن و قبح کا واحد معیار اسلام کی تعلیمات اور اسوۂ نبوی ﷺ ہیں، جو پوری طرح یا جزاً اس کسوٹی

۶۳- مسئلہ اجتہاد، حوالہ سابقہ، ص ۲۰۹

۶۵- مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم علمی تبحر، اعتدال اور فقہی توُّسُح کی حامل شخصیت، حوالہ سابقہ ص ۳۵۱

پر پوری اُترے گی میں اسے قبول کر لوں گا ورنہ رد کر دوں گا۔ (۶۶)

مختصراً یہ کہ مذکورہ بالا مطالعے کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقہی معاملات میں آپ نے جو معتدل اور توازن اسلوب اختیار کیا، اس کا بنیادی طریقہ ہمیں ہندو پاکستان میں شاہ ولی اللہ کے ہاں نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی فقہی مسالک میں کسی ایک مسلک پر شدت اختیار کرنے کے بجائے مختلف فقہی مسالک سے استفادہ کیا اور یہی اسلوب اور طریقہ فقہی مسائل میں مولانا اکبر احمد آبادی کی تحریروں میں نمایاں ہے اور جس کا تعلق درحقیقت ہندوستان میں فقہی اختلافات کے باعث گروہ بندی اور انتشار سے تھا۔ جس نے مسلمانانِ ہند کی وحدت اور یک جہتی پر کاری ضرب لگائی تھی اور یہی ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی زوال کا سبب ہے۔ غرض مولانا نے جس فقہی مسلک کو اختیار کیا اس کی بنیاد اتحاد اور یک جہتی پر تھی، جس کا مقصد مسلمانوں میں اتحاد قائم کرنا تھا۔

